ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR

CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW

Vol.03 No.01 (2025)

MIRZA HAMID BAIG: ART AND PERSONALITY – A CRITICAL ANALYSIS

مرزا حامد بیگ۔۔۔فن اور شخصیت:ایک تنقیدی جائزہ

Dr. Majid Ali
Muhammad Usman Hafeez
Dr. Farida Anjum
Dr. Mahreen latif

Abstract:

Mirza Hamid Baig, a distinguished figure in Urdu literature, was born on August 29, 1947, in Karachi. His early life was marked by frequent relocations due to his father's government service, exposing him to diverse cultural and social environments across Sindh and Punjab. From a young age, he developed a passion for storytelling, influenced by traditional oral narrations in his ancestral village, Kamala. His academic journey began in Sindhi-medium schools before transitioning to Urdu-medium education. He was profoundly inspired by cinema, art, and literature, which later shaped his literary career. The socio-cultural complexities of Sindh, including encounters with law enforcement, criminal activities, and historical events such as the capture of the infamous dacoit Shuja Bhambhro, left a lasting impact on his creative mind. This study critically examines his formative years, influences, and early experiences that contributed to his artistic and literary development.

Keywords:

Mirza Hamid Baig, Urdu literature, early life, storytelling, Sindh culture, literary influences, Pakistani cinema, Urdu-medium education.

مرزا حامد بیگ کے والد مرزا اکرم بیگ 29 جنوری 1914ء کو پیدا ہوئے۔1934ء میں اُنہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اُنہوں نے پنجاب میں سرکاری نوکری کے لیے بہت تگ و دو کی لیکن ناکام رہے۔ دو برس بے روز گار رہے اور اِسی دوران اُن کی شادی کر دی گئی۔روز گار کے سلسلے میں اُن کو کراچی جانا پڑا۔1936ء میں سندھ پولیس میں بطور سپاہی بھرتی ہو گئے۔1940ء میں اکرم بیگ کی پہلی بیوی وفات پا گئی۔اُنہوں نے دوسری شادی فقراج بیگم سے کی جس کے بطن سے 29 اگست 1947ء کو مرزا حامد بیگ کراچی میں پیدا ہوئے۔اُن کا اصل نام حامد حسین ہے۔اِسی حوالے سے مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں۔

> "کراچی میونسپل کارپوریشن سے جاری شُدہ پیدائشی سرٹیفکیٹ کے مطابق نام حامد حسین ہے۔ مرزا حامد بیگ کے تمام دستاویزات پر یہی نام درج ہے"1

مرزا حامد بیگ کا بچپن کراچی، سکھر، میرپور، ماتھیلو اور دادو میں گزرا۔ ضلع دادو میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ نہر کے دونوں طرف آموں کے باغوں میں پھرتے اور غلیلوں کے ساتھ طوطوں کا پیچھا کرتے رہتے تھے۔شروع میں مرزا حامد بیگ سندھ میڈیم میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ کیونکہ اُس وقت تک اُردو میڈیم نہیں تھا۔" تھڑی محبت" قیام کے دوران ہی اُنہوں نے اپنے کزن غلام شبیر کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔اِنہی دنوں مرزا حامد بیگ نے فلم بینی کا آغاز کیا۔اُنہوں نے اپنی زندگی کی پہلی فلم "طوفان" دیکھی۔ تھڑی محبت میں بجلی کا انتظام نہیں تھا۔اِرد گرد کے تمام لوگ مرزا حامد بیگ کے گھر ریڈیو سُننے آیا کرتے تھے۔اِسی حوالے سے مرزا صاحب لکھتے ہیں۔

> "شام کو ریڈیو کی نشریات کا آغاز ہوتا تو ہمارے بنگلے کے سامنے والے کھلے میدان میں بہشتی کے چھڑکاو کے بعد ایک میز پر ریڈیو سجا دیا جاتا اور لوگوں کا ایک بڑا ہجوم نشریات سُننے اِکٹھا ہو جاتا"2

1955ء میں اُن کے والد کا تبادلہ "ماتلی" ہو گیا۔ایک سال بعد اُن کا تبادلہ کراچی میں بطور انسپکٹر ہو گیا۔اِنہی دنوں مرزا حامد بیگ سکول سے واپس آ کر پتنگ بازی کرتے تھے۔اور مختلف برانڈ کی سگریٹ کی خالی ڈبیاں اکٹھی کرتے تھے۔ کراچی قیام کے دوران حامد بیگ کی فیملی ایک سال کے لیے

اپنے آبائی گاوں کمالہ چلی آئی۔ اور کمالہ کے پرائمری سکول میں حامد بیگ کو داخل کروادیا گیا۔ اِس گاوں میں بابانور محمد کے بیانات لوگ بڑے مزے سے سُنا کرتے تھے۔ مراز حامد بیگ نے کہانی کہنا بابانور محمد سے سیکھا۔ گاوں کی قصّہ کہانی کے حوالے سے مرزاحامد بیگ لکھتے ہیں۔

"موسم سرما کی طویل راتوں میں کمالہ کا حجرہ تادیر آباد رہتا اور اِس میں کبڑے بابانور محمد کا بیان اُس کے
کبت سُن سُن کر میں نے کہانی کہنے کا فن سیکھا"3

1957ء میں اُن کے والد کا تبادلہ حیدر آباد ہو گیا تو حامد بیگ نے حیدر آباد میں اُردو میڈیم سکول میں داخلہ لے لیا۔ اِنہی دنوں مرزاحامد بیگ نے حیدر آباد کے سینماوں میں ریلیز ہونے والی تمام پاکستانی اور ہندوستانی فلمیں دیکھیں۔ 1958ء میں مرزاحامد بیگ کے والد بطور انسپکٹر اینٹی کرپشن دادو چلے گئے۔ دادو کے ہائی سکول میں حامد بیگ نے اپنا طالب علمی کا شاندار وقت گزارا۔ اِسی سکول میں اُن کو ایک مہربان اُستاد ڈرائنگ ماسٹر مسٹر وریئل میسر آئے۔ جو آرٹ اور فنِ مصّوری کے بہت بڑے اُستاد تھے۔ مرزاحامد بیگ نے اِنہی سے مصّوری سیکھی۔ 1961ء میں اُنہوں نے ویسٹ پاکستان ڈرائنگ کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔ حامد بیگ کو کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ انہی دنوں کرکٹ کھیلتے ہوئے گیند لگنے سے اُن کے ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ دادو کے جنرل ہسپتال میں اُن کا آپریشن ہوا اور ایک ماہ بعد جاکر اُن کی ہڈی ٹھیک ہوئی۔

1962ء میں اُن کے والد کا تبادلہ "ہالہ" ہو گیا جو قدرے چھوٹا شہر تھا۔ ہالہ کے قریب ایک بڑا جنگل تھا۔ اُن دنوں کھلے آسمان تلے سینما" کچی ٹاکی" لگا کرتے تھے۔ اور وہاں طوائفوں کی آبادیاں بھی تھیں۔ سندھ کا مشہورِ زمانہ ڈاکو شجاع بھمبھرو اپنے ساتھیوں کے ساتھ اِسی جنگل میں روپوش تھا۔ اور آئے روز کسی نہ کسی بستی میں واردات ڈالنا اُس کا معمول تھا۔ ایک دن تو شجاع بھمبھرو نے اپنے ساتھیوں سمیت ایک بس کو لوٹنے کی کوشش کے دوران مزاحمت کرنے پر آٹھ لوگوں کو سرِ عام قتل کر دیا۔ اِس جنگل میں اکثر پولیس مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ پولیس کی تعداد بہت کم تھی لیکن ڈاکووں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ لہذا پولیس کو پسپائی اختیار کرنا پڑتی تھی۔ شجاع بھمبھرو کی گرفتاری پر سندھ حکومت نے انعام بھی رکھا ہوا تھا۔ سندھ پولیس کے ساتھ ساتھ سندھ رینجر بھی اُسے گرفتار کرنے میں بُری طرح ناکام رہی۔ پھر پولیس کے ایک ڈی۔ ایس۔ پی ناصر خاں نے دھوکا دہی اور پیر پگارا کی مدد سے شجاع بھمبھرو کو گرفتار کر کے ساتھیوں سمیت قتل کر کے جعلی پولیس مقابلے کا رنگ دے دیا۔ اِسی حوالے سے حامد بیگ لکھتے ہیں۔

"اگلے روز سب نے اخبار میں پڑھا کہ ڈی۔ ایس۔ پی ناصر خاں کی سربراہی میں پولیس مقابلے کے
دوران شجاع بھمبھرو اور اُس کے ساتھی مارے گئے"4

اب ہالہ کا جنگل پُرامن ہو گیا تھا۔ اور لوگوں نے شکار کے لیے اِس جنگل کا رُخ شروع کر دیا تھا۔ مرزاحامد بیگ بھی کبھی کبھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ تیتروں کے شکار کو جایا کرتے تھے۔ ایک بار مرزاحامد بیگ اپنے والد کے ساتھ شکار کو گئے تو اُن کے والد سے غلطی سے بندوق چل جانے سے بال بال بچے تھے۔ یہاں پر جھیل منچھر میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اِس جھیل میں بے شمار مرغابیاں پائی جاتی تھیں۔ مرزاصاحب نے مرغابیوں کے شکار میں بھی حصّہ لیا۔

1962ء میں مرزاحامد بیگ کے والد کا تبادلہ سکھر ہو گیا۔ حامد بیگ نے سکھر ریلوے ہائی سکول میں داخلہ لیا جہاں اُنہیں پہلی دفعہ فارسی پڑھنے کا موقعہ ملِا۔ وہ اپنی کلاس میں ہمیشہ اوّل آتے رہے۔ اُس سکول میں اُن کے دو گہرے دوست رشید اور مجید بھی تھے جن کے ساتھ اُن کا تعلیمی مقابلہ جاری رہتا تھا۔ سکھر میں بھی مرزاصاحب نے فلم بینی کا شوق زندہ رکھا اور مختلف سینماوں میں فلم بینی کرتے رہے۔ اِسی وجہ سے اُن کی دور کی نظر کمزور ہو گئی اور اُن کو عینک لگ گئی۔

1964ء میں مرزاحامد بیگ کے والد ڈی۔ ایس۔ پی ہو گئے اور اُن کا تبادلہ شہداد پور ہو گیا۔ اور آٹھ دن بعد ہی دوبارہ اُن کا تبادلہ میر پور خاص کر دیا گیا۔ میر پور پہنچ کر مرزاصاحب تنہائی کا شکار ہو گئے۔ اور اُداس رہنے لگے۔ میر پور خاص میں چوک کے پاس ایک لائبریری تھی۔ مرزاصاحب اپنی اُداسی اور تنہائی کو دور کرنے کے لیے زیادہ تر اپنا وقت اِس لائبریری میں گزارتے تھے۔ یہاں مرزاحامد بیگ کو پریم چند، کرشن چندر، بلونت سنگھ، راجندر سنگھ بیدی کو پڑھنے کا موقعہ ملِا۔ اس کے علاوہ میر علی بخش تالپور کی لائبریری بھی اُن کو میسر رہی۔ میر پور سکول مرزاحامد بیگ کے گھر کے بالکل قریب تھا۔ اُن

دنوں مرزا صاحب نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ میر پور میں اُس وقت تقریباً پانچ سینما ہال تھے۔ مرزا صاحب نے اپنے اردلی شیرو کے ساتھ ان سینماؤں میں ریلیز ہونے والی تمام پاکستانی اور انڈین فلمیں دیکھیں۔ اِسی پردے پر مرزا صاحب نے دلیپ کمار، نادرہ، نرگس، وجنتی مالا، مدھو بالا، پریم ناتھ اور مینا کماری جیسے چہروں سے شناسائی حاصل کی۔ 1965ء میں پاک بھارت جنگ کی وجہ سے پاکستان میں اِنڈین فلموں پر پابندی لگادی گئی۔ 1966ء میں مرزا حامد بیگ ابھی میر پور میں ہی قیام پذیر تھے کہ جنرل ایوب خان نے مارشل لا لگادیا۔ جنرل ایوب کے خلاف جمہوری تحریک جس کو فاطمہ جناح لیڈ کررہی تھی بڑے قریب سے دیکھا۔ حالات بہت کشیدہ تھے اور دفعہ 144 نافذ تھی کسی جگہ بھی جلسے جلوسوں کی بالکل اجازت نہ تھی۔ میر پور میں ہی حامد بیگ کو فاطمہ جناح کو ایک خفیہ جلسے میں قریب سے دیکھنے کا موقعہ مِلا۔ خیر ایوب خان صاحب الیکشن جیت گئے اور فاطمہ جناح کو بُری طرح شکست ہوئی۔

1966ء میں ہی اُن کے والد کا تبادلہ میر پور سے نواب شاہ ہو گیا۔ مرزا صاحب میر پور چھوڑتے ہوئے بہت اُداس ہوئے تھے۔ اب مرزا صاحب ڈسٹرکٹ کونسل ہائی سکول کے طالب علم ہو گئے تھے۔ نواب شاہ میں ڈپٹی کمشنر ہاوس کے نزدیک ایک پارک تھا۔ مرزا صاحب اِسی پارک میں بیٹھ کر غروبِ آفتاب تک نصابی کُتب کے ساتھ ساتھ ناول اور افسانے پڑھتے تھے۔ اِسی پارک میں اُن کی ملاقات ایک ریٹائرڈ کلکٹر تھانو داس چندانی سے ہوئی جنھوں نے مرزا صاحب کی نہ صرف رہنمائی کی بلکہ اُن کو بہت سی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں۔ اِسی حوالے سے مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں۔

"اُنہوں نے مجھے رابندر ناتھ ٹیگور کی "گیتا نجلی" پڑھنے کو دی۔ ڈبلیو بی ییٹس کی انگریزی میں ترجمہ شُدہ کتاب بڑی مشکل سے پڑھی۔ اکثر لغت کا سہارا لے کر یا والد صاحب کی مدد کے ساتھ۔ اِس کے بعد چندانی صاحب سے ٹیگور کے افسانوں کا ایک مجموعہ مل گیا۔ اور میں نے اُنہیں حیران کرنے کے لیے ایک افسانے کا ترجمہ بھی کر ڈالا یوں اُنہوں نے میری کج مج تحریروں کی پذیرائی کی"5

تھانو داس چندانی آزاد خیال اور بہت ہی نفیس اِنسان تھے ایک دفعہ جب مرزا صاحب پہلی بار اُن کے گھر اُن سے ملنے گئے تو چندانی صاحب کے ساتھ مختلف مذاہب پر بڑی عمدہ گفتگو ہوئی۔ چائے پینے کے بعد مرزا صاحب واپس آنے لگے تو اُنہوں نے کانچ کے برتن ٹوٹنے کی آواز سُنی۔ چندانی صاحب مسکرائے اور حامد بیگ کے ساتھ گھر سے باہر آ کر بولے۔

"اُمید ہے تم بُرا نہ مناؤ گئے۔ میری بیوی کٹر ہندو ہے۔ اُس نے چائے کی پیالی توڑ دی۔ جس میں ابھی ابھی تم نے چائے پی تھی۔ لیکن تم اِس طرح آتے جاتے رہنا۔ کانچ کی پیالیاں تو یوں بھی ٹوٹ جاتی ہیں"6

اِس طرح ابتدائی کہانیاں لکھنے میں چندانی صاحب نے نہ صرف مرزا صاحب کی رہنمائی کی بلکہ اُن کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے اور اُنہیں مزید محنت سے خُوب سے خُوب تر لکھنے کی ترغیب دیتے رہے۔ مرزا حامد بیگ نے اِنٹر پاس کرنے کے دوران سندھ مسلم آرٹس کالج کراچی میں 67/1966ء میں ڈراما کلب کے ممبر رہتے ہوئے میوزک اینڈ ڈراما سینٹر بندر روڈ کراچی سے پیانو اور بینجو کی تربیت بھی حاصل کرلی۔ 1968ء میں اُن کے والد نوکری سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ اور سندھ کیمبل پور آ گئے۔

1970ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد اسی سال حامد بیگ سندھ پولیس میں براہِ راست انسپکٹر بھرتی ہو گئے پولیس ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد 1971ء میں مرزا صاحب انسپکٹر پولیس سندھ کی نوکری چھوڑ کر لاہور بھاگ آئے۔ ایم۔ اے اُردو کرنے کی ٹھان لی۔ 1972ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ایم۔ اے اُردو پاس کیا۔ اور فروری 1975ء میں پی ایچ۔ ڈی اُردو کے لیے رجسٹریشن ہو گئی۔ مرزا حامد بیگ نے "اُردو ادب میں انگریزی سے نثری تراجم" کے عُنوان پر مقالہ لکھ 1986ء میں اپنی پی ایچ۔ ڈی مکمل کی۔ 1972ء میں روزگار کے سلسلے میں فلم انڈسٹری میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو گئے۔ مرزا صاحب حلقہ اربابِ ذوق کے جوائنٹ سیکریٹری اور حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی کے سیکریٹری بھی رہے۔ ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے ڈراما نگاری کے ساتھ اداکاری بھی کرتے رہے۔ مرزا صاحب نے اپنے ہی تحریر کردہ ڈرامے "لاٹ صاحب کی سواری" میں اداکاری کی اور ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ 28 فروری 1974ء تا اکتوبر 1974ء اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بطور ریسرچ اسکالر نوکری کرتے رہے۔

30اکتوبر 1974ء کو بطور لیکچرار گورنمنٹ کالج جھیکا گلی مری چلے گئے۔22 دسمبر 1976ء تک وہاں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔اِس کے بعد راولپنڈی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر تعینات ہو گئے۔7 جولائی 1992ء تک وہاں خدمات سرانجام دیتے رہے۔8 جولائی 1992 کو بطور اسسٹنٹ پروفیسر اٹک کالج مقرر ہوئے۔4 جنوری 1996ء تک اِسی عہدے پر کام کرتے رہے۔5 اکتوبر 1998ء میں اِسی کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور صدرِ شعبہ اُردو بھی رہے۔14 جون 2008ء تک اِسی عہدے پر کام کرتے رہے۔15 جون 2008ء کو پروفیسر آف اُردو وصدرِ شعبہ اُردو کے ساتھ ڈین فیکلٹی آف آرٹس مقرر ہوئے۔28 اگست 2009ء کو اِس ادارے سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ اِس طرح مرزا حامد بیگ نے شعبہ تدریس کو اپنی زندگی کے تقریباً35 سال دیے۔اُنہوں نے 1977ء میں شوکت جہاں سے شادی کی اُن کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے۔

مرزا حامد بیگ کے اعزازات:

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے فن و شخصیت پر ڈاکٹر علمدار حسین بخاری کی زیر نگرانی ایم اے کا مقالہ بہ عُنوان "ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی افسانہ نگاری" بہاوالدین زکریا یونیورسٹی ملتان 1996ء میں مکمل ہوا۔اِس کے علاوہ اب تک مرزا حامد بیگ پر تقریباً کتیس سے زائد ایم اے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر مقالہ جات اور تقریباً ایک درجن سے زائد رسائلِ خاص شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ماہنامہ "توازن،لی گاوں،اُسلوب،سہسرام بھارت اور ارتکاز" کراچی نمایاں ہیں۔

مرزا حامد بیگ کی ادبی خدمات:

مرزا حامد بیگ اپنے ادبی سفر میں تقریباً ایک سو سے زائد ادبی،تنقیدی،فکری،اور فنی مقالات تحریر کر چکے ہیں۔اُن کے تحریر کردہ بے شمار ڈرامے شُہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں جس میں سرِفہرست "نیند میں چلنے والا لڑکا،کچھ وی نہیں ہویا،لاٹ صاحب کی کی سواری،کھوہ،آوازاں،قصّہ کہانی "ہیں۔حامد بیگ اب تک سینکڑوں کتابوں کے دیباچے اور پیش لفظ بھی لکھ چکے ہیں۔مرزا صاحب کئی ادبی رسائل جن میں "جرائد،لفظ،اورنگ،مشعل،گل بکاولی"وغیرہ کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔اُنہیں کئی ادبی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں جن میں رائٹر گلڈ اور نیشنل بُک کونسل ایوارڈ شامل ہیں۔مرزا حامد بیگ کو2010ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے تمغہ امتیاز سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

غیر مدون کُتب:

فنون لطیفہ کے متعلق حامد بیگ کے بڑی تعداد اشاعت کی منتظر ہے۔جنگ اخبار میں وہ فلم کے متعلق "گوشہ مرزا حامد بیگ"لکھا کرتے تھے۔اُنہوں نے فنون لطیفہ کے متعلق کالم نگاری بھی کی۔حامد بیگ نے پی۔ٹی۔وی کے لیے اُردو پنجابی میں ڈرامے تخلیق کیے۔جن میں کھوہ،کچھ وی نہیں ہویا،قصّہ کہانی،آوازاں،نیند میں چلنے والا لڑکا،لاٹ صاحب کی سواری وغیرہ شامل ہیں۔مرزا حامد بیگ کے ایچ۔ای۔سی کے تسلیم شُدہ جرنلز میں شائع ہونے والے مضامین کو کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔اُن کی آپ بیتی "گزر گئی گزاران"کا ایک حصّہ تو شائع ہو چُکا ہے۔لیکن اِس کا دوسرا حصّہ اشاعت کا منتظر ہے۔

مرزا حامد بیگ کی ناول نگاری:

انار کلی:

حامد بیگ کا یہ ناول تقریباًاڑھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔اسّی کی دہائی میں اِس ناول کا پہلا حصّہ انار کلی کے عُنوان سے سہ ماہی "ادبیات "اسلام آباد سے شائع ہوا۔اِس ناول کو دوست پبلی کیشنز اسلام آباد نے 2017ء میں شائع کیا ہے۔مرزا صاحب نے شروع میں اِس ناول کو تقریباًایک ہزار صفحات میں ترتیب دیا۔لیکن بعد میں اُنہوں نے کانٹ چھانٹ کر کے اِس کو دو سو پچاس صفحات تک محدود کر دیا۔مرزا حامد بیگ نے نہایت اختصار کے ساتھ ہندوستان کی چار سو سالہ تاریخ کو اڑھائی سو صفحات میں سمو دیا ہے۔مرزا صاحب نے اِس ناول کو تقریباً کتیس سال کے طویل عرصے میں تخلیق کیا۔حالانکہ یہ بات پڑھنے اور سُننے میں بڑی عجیب لگتی ہے۔لیکن ناول "انار کلی"مرزا حامد بیگ کی محنت اور لگن کی زندہ مثال ہے۔مرزا صاحب کا یہ کمال ہے کہ اُنہوں نے اِسے تحقیقی مقالے کی بجائے کہانی میں اِس خُوبصورت انداز سے رنگ بھرا ہے کہ حقائق کے ساتھ ساتھ حوالہ جات کو بھی کہانی کے اندر نہایت چابکدستی

سے سمجھوتہ کر دیا کہ تحریر میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ جین آسٹن نے کہا تھا کہ "ناول ہی وہ واحد صنف ہے جس میں کہانی، المیہ، تاریخ اور شاعری کے لیے جگہ موجود رہتی ہے" مرزا حامد بیگ کا ناول "انار کلی" اِس تعریف پر پورا اُترتا ہے۔ اِس ناول کے لیے مرزا حامد بیگ نے اپنی ہزاروں راتوں کی نیند قُربان کی ہے، تب جا کر کہیں لمبے عرصے بعد یہ فن پارہ ہمارے سامنے آیا ہے۔

"انار کلی" کی کردار نگاری:

مرزا حامد بیگ کے ناول "انار کلی" کے کردار سب سے اہم ہیں۔ ناول نگار کا نقطہ نظر فلسفیانہ انداز میں کرداروں کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ کرداروں کی نفسیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اِن کرداروں کو لے کر وہ نہایت چُستی اور فکری سوچ کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اِن کے تاریخی کردار تو اپنی جگہ مکمل اور جاندار ہیں۔ لیکن اُن کے دیگر کرداروں میں "شہریار" کا کردار اِنتہائی قابلِ قدر اور قابل تحسین ہے۔ اُن کے ناول میں کوئی بھی کردار غیر ضروری نہیں ہے۔ اُن کے کرداروں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱: تاریخی کردار

۲: عہدِ جدید کے کردار

مرزا صاحب نے تمام کرداروں کو دائروی شکل میں ترتیب دیا ہے۔ جو اِس دائروی عمل میں موجود اپنی ذات سے متعلق چھوٹے چھوٹے دائروں کی تکمیل کے لیے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ قاری کو سحر میں جکڑتے ہوئے حیران و پریشان کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ناول کا ہر کردار کچھ بولتا ہے تو ساتھ ساتھ کچھ سُن بھی رہا ہوتا ہے۔ یوں خارجیت کے ساتھ داخلیت، حاضر کے ساتھ غائب کی صورت حال بھی دکھائی دیتی ہے۔ جو ناول میں شعور کی رو کے لیے راستہ ہموار کر دیتی ہے۔ اِس حوالے سے "شہریار مرزا" کا کردار بہت اہم دکھائی دیتا ہے۔

انار کلی کا کردار:

مرزا حامد بیگ کے ناول "انار کلی" کے تاریخی کرداروں میں سب سے اہم کردار انار کلی کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایران کا ایک سوداگر اپنے اہل و عیال کے ساتھ سفر پر تھا کہ ڈاکوؤں نے اُسے مار ڈالا اور اُسکی خُوب رو بیوی راجہ مان سنگھ جو کابل کا حکمران تھا کے ہاں فروخت کر دی گئی۔ اور مان سنگھ نے اُسے بادشاہ اکبر کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کر دیا۔ بادشاہ اکبر نے اُس کے حُسن سے متاثر ہو کر اُسکا نام "انار کلی" رکھ دیا۔ اور دربار میں اُسے رقاصہِ خاص کا درجہ دے دیا۔ انار کلی اِس ناول کا بُنیادی کردار ہے۔ جس کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے۔ اِس کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ ناول اِسی کردار کے نام سے موسوم ہے۔ مرزا حامد بیگ "انار کلی" کے تعارف میں لکھتے ہیں۔

> "انار کلی ایک خُوبصورت کنیز ،اکبر بادشاہ کی تھی۔ نام اصل اُس کا نادرہ بیگم یا شریف النساء سُنا جاتا ہے۔ بادشاہ اکبر نے اُس کا نام انار کلی رکھا اِس باعث سے کہ وہ بہت خُوبصورت تھی"7

انار کلی کا پلاٹ:

اگر ناول میں پلاٹ کی بات کی جائے تو ناول "انار کلی" کا پلاٹ انتہائی جاندار، مضبوط اور منظم ہے بلکہ ناول میں حقیقی اور مجازی انار کلی کے حوالے سے دو پلاٹ ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔ دونوں پلاٹ ایک دوسرے کے ساتھ اِس طرح مربوط ہیں کہ ایک کہانی دوسری کو متاثر نہیں کرتی۔ بلکہ اِس میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ ناول "انار کلی" کے پلاٹ کے حوالے سے زینت عباس لکھتی ہیں۔

> "مرزا حامد بیگ کے ناول "انار کلی کا پلاٹ ایک منظم اور مربوط ہے جو اپنے اندر دو کہانیاں لیے ہوئے ہے۔ دونوں کہانیاں ایک لڑی کی طرح پرو دی گئی ہیں۔ جس میں ایک لڑی بھی نِکال دی جائے تو خلا پیدا ہونا یقینی امر ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے۔ کہ ناول "انار کلی" کا پلاٹ اِس کی کامیابی کی دلیل ہے "8

مرزا حامد بیگ نے ناول میں استفہامیہ لہجہ اپنایا ہے۔ وہ قدم قدم پر خود ہی سوال اُٹھاتے ہیں۔ اور خود ہی اُن کے جوابات فراہم کر دیتے ہیں۔ جو ناول کے پلاٹ میں کوئی خلا باقی نہیں رہنے دیتے۔ اگر کسی کڑی کو منفی کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو خلا کا پیدا ہونا فطری عمل ہو گا۔ حامد بیگ پورے ناول

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR

CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW

Vol.03 No.01 (2025)

میں اکبر اور سلیم کی مخالفت، انار کلی کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر کُڑھتے ضرور ہیں لیکن اکبر کی پدرانہ شفقت کو نظر انداز ہر گز نہیں کرتے۔ بلکہ ایک دیانتدار فن کار کی طرح حقیقت کو تسلیم کرتے اور نفسیاتی توجیہہ تلاشنے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔

ہر ناول کا کوئی نہ کوئی مقصدِ تحریر ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے بھی اِس ناول میں معاشرے میں پائی جانے والی نا انصافیوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ جس کی ایک نمایاں شکل غیرت کے نام پر قتل کی ہے۔ "انار کلی" کا قتل اصل میں قتلِ ناحق تھا۔ مغلیہ دور کا یہ کوئی واحد قتل نہیں تھا۔ اِس سے پہلے بھی ایسے واقعات رونما ہوتے رہے ہوں گے۔ لیکن تاریخ میں اِس قتل کے معروف ہونے کی بازگشت آج کے دور میں بھی سُنائی دیتی ہے۔ اِس ناول میں دو کہانیاں برابر چلتی ہیں۔ ایک کہانی شہریار مرزا اور شازیہ جبکہ دوسری کہانی اکبر اعظم، شہزادہ سلیم اور انار کلی کے گرد گھومتی ہے۔ مرزا حامد بیگ نے اِنتہائی متاثر کن انداز میں کہانی بیان کی ہے۔ اور تو اور ناول میں واقعات کا تاریخی تسلسل قاری کو اپنے سحر میں جکڑے رکھتا ہے۔ جو مرزا صاحب کی اپنے فن سے محبت اور کامیاب ناول نگار ہونے کی دلیل ہے۔ مرزا صاحب نے اِن تمام عوامل کا تجزیہ کیا ہے جس کی وجہ سے اکبر کے عہد اور بعد کے لکھنے والوں نے "انار کلی" کی موت کو چھپانے کی سر توڑ کوشش کی تا کہ شاہی خاندان کے ماتھے سے زنا بالمحرمات کا داغ دھویا جا سکے۔

کہانی کا مرکزی خیال اہم چیز ہوتی ہے۔ "انار کلی" کے مرکزی خیال بارے مختلف ناقدین نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔ کسی نے اِس ناول کو سماجی اور طبقاتی پسِ منظر تو کسی نے اِس کو دو نسلوں کے درمیان روحانی کشمکش کی روداد کہا۔ لیکن اصل میں انار کلی کا مرکزی خیال سچے عشق کا سماوی تصوّر ہے۔ جس کی شُہرت اور عظمت کا زمانہ آج بھی گُن گاتا ہے۔ ناول نگار مکالمہ نگاری کی مدد سے کہانی اور کرداروں کو زندہ و جاوید کر دیتا ہے۔ مکالمے دو طرح یعنی خود کلامی اور کرداروں سے گفتگو کرنے سے سامنے آتے ہیں۔ مرزا حامد بیگ نے ناول "انار کلی" میں مکالموں کو برجستگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ناول میں اگرچہ مکالمے کم ہیں لیکن انتہائی موزوں اور دلچسپ ہیں۔ مکالمے کرداروں کے خیالات، جذبات اور اِحساسات کو عیاں کرتے ہیں۔ اور کرداروں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ لہذا مرزا حامد بیگ نے مکالمہ نگاری میں اِنتہائی کمال مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

ناول "انار کلی" ایک خاص تاریخی پسِ منظر کا حامل ہے۔ اِس موضوع پر مرزا صاحب سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ لیکن مرزا صاحب نے اپنی کئی سالوں پر محیط محنتِ شاقہ سے تحقیق و تفتیش کرتے ہوئے حقائق سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اسی حوالے سے زینت عباس لکھتی ہیں۔

> "انار کلی" پر اُردو میں سب سے پہلے عبد الحلیم شرر نے مختصر ناول لکھا۔ لیکن "انار کلی" کو اِمتیاز علی تاج نے اپنے ڈرامے کے ذریعے عوام و خواص سے متعارف کروایا۔ پردیپ کمار کی فلم "انار کلی" اور کے آصف کی ہدایت میں بنی فلم "مغلِ اعظم" نے انار کلی کو لازوال شُہرت بخش دی۔ محمد دین فوق نے بھی ناول "انار کلی" لکھا۔ مرزا حامد بیگ کا ناول "انار کلی" سامنے آیا۔ جس میں مرزا حامد بیگ نے تحقیق و تفتیش کے ذریعے ایسے بہت سے حقائق سامنے لائے ہیں۔ جو اِس سے پہلے ناقدین کی نظر سے نہیں گزرے اگر گزرے بھی ہیں تو کسی نے آج تک بیان نہیں کیے"9

مرزا حامد بیگ نے ناول "انار کلی" کی کم مائیگی دور کر کے نہ صرف اِس کو شُہرتِ دوام بخش دی ہے بلکہ تاریخ بھی مکمل طور پر تبدیل کر دی ہے۔ مرزا حامد بیگ نے ایک لمبے عرصے تک اُردو، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں موجود تمام حوالوں تک رسائی حاصل کی اور اکبر کے عہدِ لاہور کے متعلقات بارے بڑی محنت اور گہرائی سے چھان بین کر کے حقائق تلاش کیے ہیں۔ مرزا صاحب نے بڑی محنت سے عرفی کے دو شعر تلاش کیے ہیں جس کے مطابق یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ بات طے شُدہ ہے کہ کوئی بھی خُوبصورت دوشیزہ بیٹے کے لیے اُس وقت تک حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ باپ کی خواب گاہ کی زینت نہ بنے۔ مرزا صاحب کے نزدیک ہر ادنی اور اعلیٰ سے حاصل کردہ فتوے کے ذریعے وقت کی دُلہن کو بہ یک وقت باپ اور بیٹے کے لیے حلال قرار دیا گیا۔ عرفی کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہمیشہ تا آں کہ نگردد حلال بر فرزند

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.01 (2025)

جمیلہ تاکہ شود باپدر بہ حجلہ مقیم

عروس دہر بفتویٰ ذرہ تا خورشید

حلال اکبر شاہ باد و شاہزادہ سلیم

مرزا حامد بیگ نے اِنتہائی چابک دستی سے تاریخی واقعات کا تجریہ کیا ہے۔ اُنہوں نے انار کلی، اکبر اور شہزادہ سلیم کے بارے بہت سے چھپے ہوئے رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ مرزا حامد بیگ کے نزدیک اکبر اور اُس کے حواریوں نے انار کلی کی موت چھپانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اِس کام میں سب سے اہم کارنامہ ابوالفضل نے سرانجام دیا۔ اکبری دور کے شاعر عرفی کے نزدیک بیک وقت بادشاہ اکبر اور شہزادہ سلیم نے انار کلی سے تعلقات قائم رکھے۔ اِسی بنا پر عرفی کو زہر دے کر مارا گیا تھا۔ لیکن مرزا صاحب کے نزدیک عرفی کو مذکورہ اشعار کی پاداش میں سلیم اور اکبر نے قتل کروایا تھا۔ میرِ عدل میر عبدالحیٔ کی عدالت میں انار کلی کے خلاف اکبر کو زہر دینے کا مقدمہ چلا۔ اکبر کے شاہی حرم کا حصّہ ہوتے ہوئے شہزادہ سلیم کے ساتھ پکڑے جانے پر انار کلی پر زنا بالمحرمات کے مقدمات کیے گئے۔ انار کلی کو سخت اذیت ناک سزا دینے اور جسمانی تشدد کے باوجود اُس نے عدالت میں اکبر کو زہر دینے کا اعتراف نہ کیا۔ آئینِ اکبری کے مطابق انار کلی کو دوسرے مقدمے زنا بالمحرمات میں ناک کان کاٹ کر نظروں سے اوجھل کرنے کے لیے اُسے دیوار میں زندہ چُنوا دیا گیا۔ یہاں اکبر بادشا کی آمرنہ سوچ کھل کر سامنے آتی ہے۔ جو انار کلی کو زنا کے بدلے میں تو زندہ درگور کروادیتی ہے جبکہ اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے۔ اِس طرح دورِ اکبر کے نظامِ عدل پر سوال اُٹھ جاتے ہیں۔ مرزا حامد بیگ کے نزدیک انار کلی کو 29 نومبر تا 6 دسمبر 1799ء کی درمیانی مدت میں زندہ دفن کیا گیا۔ مرزا حامد بیگ نے اصل حقائق کی تلاش کے لیے لمبا عرصہ چھان بین میں لگا دیا۔ عہدِ اکبری کی بیشتر عمارتیں موجود ہیں جن میں حرم شاہی کی بیگمات اور لونڈیوں کے حجروں کی صرف بُنیادیں باقی ہیں۔ قلعہ لاہور کے مسجدی دروازے کے پاس انار کلی کے حجرے کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اُنہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن پر اپنے ایک انٹرویو "کسبِ کمال" میں کہا کہ انار کلی کی روح میرے اندر گھس گئی تھی جو مجھے مجبور کرتی تھی کہ میں اُس کی زندگی کا سچ سب کے سامنے رکھوں۔ اس لیے میں صبح سے لے کر شام تک حقائق کی تلاش میں سرگرداں ان کھنڈرات میں مارا مارا پھرتا رہتا تھا۔ مرزا صاحب نے اپنے اِس ناول میں اکبر کے دینِ الہیٰ اور لوگوں کی دین الہٰی میں شمولیت کا ذِکر بھی کیا ہے۔ مرزا صاحب نے اپنی تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا کہ حضرت داتا گنج بخش کی قبر بارے بیان ہوا کہ یہ لاہور راوی کے کنارے تھی جو سراسر غلط ہے۔ حامد بیگ نے یہ بات بھی ثابت کی ہے کہ معروف ڈرامہ "انار کلی" سید امتیاز علی تاج کا نہیں بلکہ ایس۔ کے فیروز کا ہے۔ اُنہوں نے سید امتیاز علی کی انار کلی سے تقریباً دس سال پہلے لکھا۔ حامد بیگ نے اپنے اِس ناول میں یہ بات بھی ثابت کی کہ انار کلی کے مقبرے میں گنبد کے نیچے کوئی قبر نہیں ہے۔ بلکہ 1852ء میں مقبرہ انار کلی کو چرچ بنانے کی صورت میں اُس کا جسدِ خاکی نِکال کر صدر دروازے سے ملحقہ بائیں چوبرجی کے نیچے دفن کیا گیا۔ جہاں وہ اب بھی موجود ہے۔ انار کلی کا اصل نام شریف النساء بیگم لیکن عرفِ عام میں اُس کو نادرہ بیگم کہا جاتا تھا۔ مرزا حامد بیگ نے پہلی بار اِس نقطے کی طرف توجہ دلائی کہ اکبر کے بیٹے جہانگیر نے نہ صرف اپنی بیٹی کا نام نادرہ رکھا بلکہ اپنے دو شہزادوں شاہجہاں اور شہزادہ پرویز کی دو بیٹیوں کے نام بھی نادرہ رکھے۔ تاریخی سطح پر مرزا حامد بیگ کے ساتھ اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ مثلاً عرفی کے جن دو اشعار کے اُوپر حامد بیگ نے اپنے ناول کی بُنیاد کھڑی کی ہے۔ اِن اشعار کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ایک ہی وقت میں کوئی عورت باپ اور بیٹے پر حلال نہیں ہو سکتی۔ مگر وقت کی دُلہن ایک وقت میں دونوں پر مہربان ہے۔ اِسی لیے دونوں کا ستارہ عروج پر ہے۔ عرفی کا اِنتقال 1591ء میں ہوا جب کہ انار کلی کو مبینہ طور پر 1599ء میں زندہ درگور کیا گیا۔ عرفی کے زمانے میں سلیم کا اگر انار کلی سے عشق زبان زدِ عام تھا۔ اور اکبر نے عرفی کی وفات کے نو سال بعد انار کلی کو زندہ درگور کیا ہو۔ لیکن مرزا صاحب کے ناول کی اہمیت اور خُوب صورتی پر سوال نہیں کیا جاسکتا۔ اِس ناول کی خاص بات یہ ہے کہ یہ قدیم ہونے کے باوجود بھی جدید ہے۔

منظر نگاری:

اگر کوئی ناول تاریخی ہو اور اُس میں منظر نگاری نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔لہذا مرزا حامد بیگ نے موضوع سے انصاف کرتے ہوئے سماجی اور مادی منظر نگاری دونوں کو برتا ہے۔ اُنہوں نے شاہی ماحول کو اِتنے خُوبصورت اور باریک بینی سے پیش کیا کہ قارئین اپنے آپ کو اُسی عہد میں چلتا پھرتا محسوس کرتے ہیں۔ مرزا صاحب نے سماجی منظر نامہ واضع کرتے ہوئے تمام حالات و واقعات اِنتشار کی صورتِ حال کو خاص ترتیب سے پیش کیا ہے۔ مادی منظر نگاری میں اُنہوں نے مکانوں، سڑکوں، شاہی محلات کی جُزئیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ اپنے ناول میں اپنے قارئین کو قلعہ لاہور کی سیر کرواتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ منظر نگاری میں کرداروں کے حُلیے اُن کی عادات و خصائل اور اُن کے رہن سہن کو بڑے عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ حویلی، بارہ دری، ایوانِ خاص، شیش محل، خلوت خانہ، نولکھا، دروازوں، بُرجوں، حجروں کے طویل سلسلوں کے بیان کے ساتھ اِن میں خوف کی فضاء، سزا اور جزا، ظلم و دہشت سے بھرپور، پُراسرار مگر مکمل منظر نامے کو اِس طرح ترتیب دیا ہے کہ ہر کردار اپنے اپنے حصّے کی ذِمہ داری نبھاتے ہوئے رازوں سے پردہ ہٹاتے جاتا ہے۔

اُسلوب:

ناول کا اُسلوب اِنتہائی دلکش اور خُوبصورت ہے اِس کی بدولت کہانی سُست روی سے نہیں بلکہ ایک خاص ترتیب سے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی قاری پر گراں نہیں گزرتی بلکہ پرت در پرت حقیقت کھل کر سامنے آتی جاتی ہے۔ مرزا صاحب نے درست اِملا کا خاص خیال رکھا ہے۔ بلکہ اِس ناول کے شروع میں ہی انتباہ کے عُنوان سے ایک عبارت لکھی دی ہے جو درج ذیل ہے۔

مروج غلط اِملا کے عادی اِس ناول کو پڑھتے ہوئے کسی قدر دقت محسوس کر سکتے ہیں

مرزا صاحب نے اپنے ناول میں علامات کا استعمال اِنتہائی عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ مرزا حامد بیگ نے اپنے ناول بارے اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "غرض مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ تواریخ، فلم، مضامین اور ناولوں کی موجودگی میں اِتنے عرصے بعد منظرِ عام پر آنے والی انارکلی سے متعلق تحقیق ایک نئ سمت اور نئ جہت ہی نہیں بلکہ اُردو ناول کی تاریخ میں بھی ایک نئے سفر اور جدت کی نوید ہے جو آئندہ ناول نگاروں کے لیے تحقیق و تفتیش کے پُلِ صراط سے گزرنے کے لیے ایک کڑے اِمتحان کی پیش گوئی بھی ہے۔ کیونکہ اِس کے بعد ادب کے باذوق اور سنجیدہ قارئین کے لیے کسی بھی دستاویزی ناول میں بغیر تحقیق و حوالہ جات کے کسی ارضی حقیقت کو ماننے میں تامل ضرور ہوگا"10

تار پر چلنے والی "ناولٹ "فنی و فکری تجزیہ:

یہ کتاب 1 ناولٹ اور 11 افسانوں پر مشتمل ہے۔ اِس کتاب کا اِنتساب محمد خالد کے نام ہے۔ اِس کی پہلی اشاعت 1984ء کو پولیمر پبلی کیشنز لاہور سے جبکہ اشاعت دوم 2005ء میں دوست پبلی کیشنز نے اسلام آباد سے کی۔

مرزا حامد بیگ نے یہ ناولٹ 1974ء میں لکھا۔ یہ ایک علامتی کہانی ہے جو مرزا صاحب نے اپنی بھرپور جوانی کے دور میں لکھی۔ یہ ناولٹ بھی باقی ناولٹ کی طرح ایک عام فہم، سادہ اور علامتی کہانی ہے۔ ناولٹ میں اِس قبیل کا کوئی حقیقی کردار نہیں۔ اِس ناولٹ کی ہیروئن کا کوئی نام نہیں ہے۔ جسکو تار پر چلنے والی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ اِس ہیروئن کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ وہ اِنتہائی غریب مجبور اور کسمپُرسی میں زندگی گزارنے والی لڑکی ہے۔ لیکن شہر میں آکر جب وہ یونیورسٹی میں داخلہ لیتی ہے تو اپنے رکھ رکھاو کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اِس کے بارے یہ بات بھی مشہور ہے کہ شہر میں اُس نے کئی ایک یار بنا رکھے ہیں جس پر کہانی کا ہیرو سیخ پا اور نالاں ہے۔ وہ ہیروئن کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اور بار بار اُس پر صرف اپنا حق جتاتا ہے۔ جب وہ اپنی عیاشی کی وجہ سے تعلیم پر توجہ نہیں دے پاتی اور کچھ پیپرز میں فیل ہو جاتی ہے تو وہ اُس کو پاس کروانے کے لیے ہر حد تک جانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر

ایک رات جب وہ دونوں آوارہ گردی کرتے ہوئے خراب موسم میں پھنس جاتے ہیں۔ تو باہمی رضامندی سے اُن کو ایک رات ہوٹل میں اِکٹھا گزارنا پڑتی ہے۔ شبِ وصل کے بعد جب ہیروئن اپنے گھر واپس چلی جاتی ہے تو کہانی کے ہیرو کو جو کہ ایک ادیب ہے بغیر عُنوان ادھوری کہانی چھپوانے کے لیے بھجواتی ہے۔ اُس کہانی میں ایک طرح کے اپنے گھریلو حالات کا بیان کیا ہوا ہے۔ جو کافی سنگین ہیں۔ پھر اچانک یہ ناولٹ تشنگی اور ویرانی کا ایک شدید احساس قاری کو دے کر ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کہانی کی یہی خُوبی ہے کہ قاری اِس کو پڑھنے کے بعد اِتنا اثر ضرور لیتا ہے کہ کافی دیر سوچ میں پڑا رہتا ہے۔ کہانی کا یہی ادھورہ پن اِس کی خاص بات ہے۔ اور علامتی انداز کہانی کو چار چاند لگائے ہوئے ہے۔ مرزا صاحب نے اُسلوب کی سطح پر ایک انوکھا تجربہ کیا جس سے پاکستانی اُردو ناولٹ میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ بے نام کرداروں، مکالماتی اور علامتی انداز کو قاری آہستہ آہستہ قبول کر لیتا ہے۔ تار پر چلنے والی قاری کے تجسس کو پوری طرح اُبھارنے اور اپنی گرفت میں رکھنے والا نام ہے۔ کہیں نہ کہیں ایسا گمان ہوتا ہے کہ مرزا حامد بیگ نے اِس ناولٹ میں اپنی لاہور کی زندگی کا کوئی پہلو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناولٹ کی زبان اِنتہائی صاف اور شفاف ہے۔ اِس ناولٹ کا آغاز سہیل احمد کی ایک خُوبصورت نظم سے ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کبھی آنکھ میں نئی روشنی
کبھی سُرخ ہونٹوں کے درمیاں
وہی اک تبسم بکھرا اں
کبھی چھتری سر پہ کئے ہوئے
کبھی سُرخ پھولوں کو تھام کر
یونہی تار پر کبھی اِس طرف
یونہی اُس طرف کبھی تار پر
اِسی برف زار میں رات کے
وہ بدن کے شُعلے کا پھول تھی 11

مرزا حامد بیگ کی افسانہ نگاری:

مرزا حامد بیگ کیمبل پور کے علاقے چھچھ کے ایک گاوں "کمالہ" کے رہنے والے تھے۔ اور اُن کی مغل حویلی اور گاوں کے چاروں طرف کوسوں دور تک پھیلے اُجاڑ میدان مغلوں کی جاگیریں جو کبھی آباد رہی ہوں گی۔ یہی وہ منظر نامہ ہے جو حامد بیگ کے افسانوں میں جابجا دکھائی دیتا ہے۔ اور اِس سے جُڑا ہوا مغل اجتماعی لاشعور کروٹ لیتا ہے۔ مرزا حامد بیگ کی افسانہ نگاری کے حوالے سے سید شبیر شاہ "افسانے کا مغل شہزادہ" میں لکھتے ہیں۔

> "اُردو افسانے کا ایک مغل شہزادہ ہے جسے اپنے گردوپیش کے جملہ لوازمات کی فکر دامن گیر ہے۔ اور جو اپنے سارے سنگی ساتھیوں کے ہمراہ اپنی جاگیر میں گھومتا پھرتا ہے۔ اُسے نہ تو مزید علاقے فتح کرنے کا شوق ہے اور نہ راج سنگھاسن پر دُشمن کے حملے کا شعور۔ وہ محلاتی سازشوں سے مکمل طور پر بے پروا ہے۔ یہ وہی ہے جو اَن دیکھے اندھیرے میں اُترنے سے خوف زدہ ہے۔ لیکن یہ شہزدہ اپنے تشخص کی شناخت کی جاں توڑ جدوجہد کرتا ہوا جب تصورات کی دُنیا تیاگ کر موجود دُنیا کے گلی کُوچوں میں پہنچتا ہے۔ تو اُسے یکدم ایک بڑا افسانہ نگار بن جانا چاہیے؟"12

حامد بیگ نے اپنا پہلا افسانہ "بالہ" سندھ 1961ء میں تحریر کیا۔ جب مرزا صاحب نے یہ افسانہ اپنے والد گرامی کو سنایا تو اُنہوں بالکل خوشی کا اظہار نہ کیا۔ حالانکہ وہ خود انگریزی زبان و ادب میں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب کی عمر اُس وقت تقریباً گیارہ سال تھی اور آپ چھٹی کلاس کے باقاعدہ طالب علم تھے۔ وہ اپنی کہانی اپنے والدِ مکرم کو سُنا کر اُن سے حوصلہ اور داد سمیٹنا چاہتے تھے۔ لیکن ایسا ہرگز نہ ہو سکا۔ حامد بیگ صاحب نے اِس چیز کا گہرا اثر لیا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے جو بھی لکھا اُس کو پھاڑ دیا۔ اُن کے اندر اپنی کہانی کسی کو سُنانے اور دکھانے کی سکت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ مرزا صاحب کی یہ انا اُن کو برباد کیے

جارہی تھی۔اُن کی اِسی احساسِ کمتری اور انا کا رُخ موڑنے میں استادِ مکرم سجاد باقر رِضوی نے اہم کردار ادا کیا۔اُنہوں نے اُنکی حوصلہ افزائی کی اور اُنکو مزید لکھنے کی ترغیب دی اِسی حوالے سے مرزا حامد بیگ صاحب لکھتے ہیں۔

> "اُستاد محترم سجاد باقر رِضوی نے اچھا ہی کیا کہ میری انا گویا یوں کہنا چاہیے کہ مغلیہ تلوار کو کند کر دیا۔اب میرے شملے کا طرّہ خم کھایا ہوا ہے۔ترَکش کے سارے تیر میں نے آسمان کی سمت اُچھال دیے ہیں۔شاید زمانہ آئے گا جب میرے اُچھالے ہوئے تیر زمین کی طرف پلٹیں گے تب میں کھلے میدانوں میں،گلیوں اور بازاروں میں،منافقوں کے اُجاڑ دِلوں میں اور محبت کی سر زمین پر واویلا کرتے ہوئے اِن تیروں کو اپنے سینے میں سمیٹنے کا جتن کروں گا مبادا کسی کا دل دُکھے"13

مرزا حامد بیگ کے سامنے اب دو ہی راستے تھے یا تو وہ چُپ چاپ بیٹھا دوسروں کے گھنٹوں کے بجتے طوق کی آواز سُنتا رہے اور اندر ہی اندر بے بسی پر کُڑھتا اور روتا رہے۔یا پھر اپنی جھوٹی انا اور احساسِ کمتری کے خلاف بغاوت کر دے۔مرزا حامد بیگ کے اندر اضطراب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سُمندر موجزن تھا۔وہ اپنے آپ کو اخبار کے خوش نویس سے بھی کم تر تصّور کر رہے تھے۔اُن کے نزدیک اخبار کا خوش نویس اُن سے اچھا ہے جو اپنی مرضی سے جو بن پڑتا ہے اُس کا اظہار تو کرلیتا ہے۔وہ اہم خبر لکھتے وقت اِس میں تاثیر تو پیدا کر دیتا ہے۔جس سے پڑھنے والے لطف اندوز ہو جاتے ہیں۔وہ افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ اُن سے تو یہ بھی نہ ہو سکا۔لہذا اُنہیں اپنے ادب پر فخر ہے اور اِس پر دل و جاں سے فدا ہیں جو اُن کی کتابوں میں قید تنہائی کاٹ رہا ہے۔حامد بیگ صاحب کو اپنا قاری چننے میں غلطی محسوس ہوتی ہے۔بلکہ اُنہوں اِس چیز کا یہ بھی اعتراف کیا کہ اُنہوں یہ سب جان بوجھ کر کیا تاکہ وہ ایسے اہلِ فن سے داد وصول کر سکیں۔جن سے کبھی کسی نے تعریفی کلمات نہ سُنے ہوں۔

حامد بیگ نے عام لوگوں سے رابطہ قائم نہ رکھا اُنہوں نے اِس چیز کو خود بھی تسلیم کیا کہ یہ سب اُنہوں نے جان بوجھ کر کیا۔اُنہوں نے تھوڑا فاصلہ رکھ کر عام لوگوں کی ذوقِ تربیت کرنا چاہی یا کم از کم اُنہوں نے ایسا سوچا ضرور۔سو مرزا صاحب اپنے قاری اور ناقد کے لطف کرم پر " آہ اور واہ"کا فرق بھول گئے۔بس اپنی واردات کو قلمبند کرتے چلے گئے ہیں۔مرزا حامد بیگ فرانسیسی زوال پسندوں کے تخلیق کردہ ادب سے متاثر ہیں۔اُن کی افسانہ نگاری میں فرانسیسی ادب کا گہرا اثر محسوس کیا جاسکتا ہے۔اِسی حوالے سے راغب شکیب لکھتے ہیں۔

> "انہیں اِس بات کا خود اعتراف ہے کہ وہ فرانس کے زوال پرست ادیبوں سے بہت متاثر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی تحریروں میں احساسِ تنہائی،کرب،بے آہنگی اور معاشرے سے بے زاری کے جذبات خاصے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔تاہم اُن کا اُسلوبِ نگارش ہماری توجہ اپنی طرف مبذول ضرور کراتا ہے"14

مرزا صاحب موجودہ تہذیبی نظام سے مطمئن نظر نہیں آتے۔بلکہ وہ عام آدمی کو مِن و عَن قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اُنہوں نے اپنی کہانیوں میں اذیتیں اور تنہائیاں بیان کیں ہیں۔اب اگر کوئی یہ کہے کہ مراز صاحب تنہا پسندی کے جذبے میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔تو اُن کو دُکھ ہوتا ہے۔کیونکہ وہ تو زندگی کے اِس ناقابل برداشت حصار میں جینا چاہتے ہیں۔مرزا صاحب کو اِس چیز کا بھرپور احساس ہے کہ وہ اپنے قاری کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔جب وہ اپنی ذات کے سناٹے میں سفر کرتے ہیں۔اُن کی ذات کا سناٹا قاری کی ذات میں دکھائی دینے لگتا ہے۔وہ اِس چیز کو برداشت نہیں کرپاتا۔مرزا صاحب چاہتے ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے کو بُرائیوں سمیت ہی کھلے دل کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے۔مرزا حامد بیگ علامتی اظہار کو احساسات اور جذبات کا کھرا اِظہار مانتے ہیں۔اُنہوں نے اپنے افسانوں میں جابجا علامتوں کا استعمال کیا ہے۔مرزا حامد بیگ کے افسانوی مجموعہ "جانکی بائی کی عرضی"کے تمام افسانوں میں علامت نگاری موجود ہے۔افسانہ "جانکی بائی کی عرضی"مرزا حامد بیگ کا علامتی شاہکار ہے۔یہ کہانی مذہب اور سماج کے ٹھیکیداروں پر ایک قسم کی طنز ہے۔جو معاشرے کو اپنے مطابق اور اپنی ڈگر پر چلانا چاہتے ہیں۔اور لٹھ لیے معاشرے میں موجود طوائفوں کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانک کر شہر سے باہر کر دینا چاہتے ہیں۔اِس افسانے کے دو اہم کردار رُلیارام اور جانکی بائی ہیں جبکہ باقی تمام نظر نہ آنے والے ثانوی کردار

ہیں۔رُلیارام لاہور شہر نوکری کی غرض سے آتا ہے۔ لیکن شام کو جب اُس کو شب بسری کے لیے ٹھکانہ نہیں ملتا تو ایک دلال کے ذریعے وہ جانکی بائی کے کوٹھے تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں وہ نوکری ملنے تک سکونت اختیار کرتا ہے۔وہ جانکی بائی کے ساتھ تانگے پر شام کو شہر گھومنے جاتا ہے۔جانکی بائی کو رُلیارام سے عشق ہو جاتا ہے اور وہ اُسے اپنے سر کا تاج تصّور کرتی ہے۔میونسپلٹی میں نوکری ملنے کے بعد رُلیارام جانکی کو بھلا دیتا ہے۔ لیکن نوکری سے سُبکدوش ہونے کے بعد ایک دن پُرانی فائلوں پر جانکی کا نام دیکھتا ہے۔تو اُس کو اپنی جوانی کا وہ حسین وقت یاد آتا ہے جو اُس نے جانکی کی بانہوں میں گزارا تھا۔ لیکن اُس کے جذبات واحساسات ابھی زندہ ہیں وہ اب اِنتہائی بوڑھا ہو چُکا ہے اور اپنی لاٹھی لیے جانکی بائی کے کوٹھے کا رُخ کرتا ہے لیکن جب وہ اُس کے دروازے پر پہنچتا ہے تو وہاں ایک زنگ آلود تالا لگا ہوتا ہے۔اصل میں زنگ آلود تالا رُلیارام کی زنگ آلود زندگی کی علامت ہے۔رُلیارام دل کا مریض ہے اور واپس مڑتے ہوئے وہ جانکی بائی کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا ہے۔اور اُس کے دماغ میں جانکی سے بے وفائی کے خیالات کا ایک طوفان ہے۔اِسی ذہنی دباو کی وجہ سے اُسکو دل کا دورہ پڑتا ہے۔اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جاملتا ہے۔ساری رات جانکی بائی کے کوٹھے کی دہلیز پر مردہ حالت میں پڑا رہتا ہے۔لاہور میں جہاں سے اُس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا وہاں پر اپنی جان دے کر اُس نے اپنی بے وفائی کا کفارہ ادا کر دیا۔ جانکی بائی کی عرضی درد کی تنہائی کو اُجاگر کرنے والی کہانی ہے۔رُلیا رام اِس کا مرکزی کردار ہے۔جو جانکی بائی کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچتا ہے۔باقی کردار جو نظر نہیں آتے لیکن سماجی اُتھل پتھل کی عکاسی کرتے ہیں۔انفرادی طور پر اِس افسانے کو درد کی تنہائی کو اُجاگر کرنے والا افسانہ کہہ سکتے ہیں۔مرزا حامد بیگ نے غلام عباس کے افسانے "آنندی" سے تھوڑا آگے نِکل کر سوچا ہے۔غلام عباس اور حامد بیگ میں جو قدرِ مشترک دکھائی ہے وہ مذہب اور معاشرے کے ٹھیکیداروں کا طوائف کے بارے میں رویہ ہے۔جو کبھی بھی اُس کو معاشرے کا حصّہ بنتے نہیں دیکھنا چاہتے۔غلام عباس طوائف کو معاشرے کی ضرورت تصّور کرتے ہیں تو حامد بیگ اِس سے تھوڑا آگے کی سوچتے ہیں کہ طوائف تو کسی کی خوشی، مدد اور کامیابی کا راز بھی ہو سکتی ہے۔

بڑی نثر اور بڑی شاعری کی خُوبیاں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ بلکہ عمدہ نثر تو بڑی شاعری کی طرح غنائیت کی تمنا بھی کرتی ہے۔حامد بیگ کا افسانہ بھی ایسی ہی نثر کی آرزو کرتا ہے۔جو مطالب کی گردن مروڑ سکے۔مرزا حامد بیگ نے احساساتی سطح پر علامات کا ایک نظام وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔اُن کے نزدیک ہماری زبان لغت کی پابند ہے۔مرزا صاحب کے نزدیک لفظوں میں نئ جان اور زندگی بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کو نئے ڈھنگ سے برتا جائے۔بلکہ اُنہیں میلے برتنوں کی طرح مانجھ کر صاف ستھرا کیا جائے۔مرزا صاحب کو اپنے قاری پر بھی شکوہ ہے کہ وہ بھی بندے ٹکے فارمولوں سے باہر نِکل آئے۔

حامد بیگ کے افسانوں کا اُسلوب تہہ دار، پیچیدہ اور استعاراتی ہے۔اُن کا اُسلوب تجریدی معنویت کی بجائے تجرباتی معنویت کا حامل ہے۔اُن کے اُسلوب میں لفظی ابہام کی بجائے معنیاتی ابہام نظر آتا ہے۔اُنہوں نے چھوٹے چھوٹے جملوں کا انتخاب کیا۔ منفرد لفظیات اور خُوبصورت استعاروں کی مدد سے اپنے لیے ایک ایسا نستعلیق اُسلوب وضع کیا جو قارئین کے لطف اندوز ہونے کے لیے مدد فراہم کرتا ہے۔اُن کا نثری اُسلوب انتہائی پُر سکون، نرم اور مدہم ہے۔مرزا صاحب کے اُسلوب میں ندرت اور تنوع کے ساتھ نو کلاسیکی اور جدیدیت کا رُجحان بھی ملتا ہے۔وہ اِنسانی معاملات میں تصّور پرستی اور سفاکانہ حد تک حقیقت پسند بھی ہیں۔مرزا صاحب نے فنی تکنیک کا استعمال بڑے عمدہ طریقے سے کیا ہے۔اِسی حوالے سے فُضیل جعفری "جانکی بائی کی عرضی" کے ابتدئیہ میں لکھتے ہیں۔

> "مرزا حامد بیگ کے افسانوی ادب میں آج بھی ندرت اور تنوع کی جو جلوہ سامانیاں ملتی ہیں۔اِس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُن کا تخلیقی مزاج بیک وقت نو کلاسیکی بھی ہے اور جدید بھی۔وہ اِنسانی معاملات میں تصّور پرست بھی ہیں اور سفاکانہ حد تک حقیقت پسند بھی۔وہ اپنے افسانوی مواد کو بڑی احتیاط کے ساتھ اور ناقابل یقین انداز میں پیش کرتے ہیں۔مزید یہ کہ وہ اپنے افسانوں میں ڈیزائن اور اپنی فنی تکنیک میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں"15

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.01 (2025)

مرزاصاحب جب اپنے باپ کو افسانہ سُنا کر داد وصول کرنے میں ناکام رہے تو وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے اور اندر ہی اندر کُڑھتے رہے۔ وہ اپنی تحریریں لکھتے رہے اور پھاڑتے رہے لیکن پنجاب یونیورسٹی میں اُن کے اُستادِ مکرم سجاد باقر رضوی نے اُن کی جھوٹی انا کی گردن مروڑ کر اُن کو ایک نئی روشنی عطا کی اور مرزاصاحب کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی بھی کی۔ بس یہی وہ وقت تھا جب مرزاصاحب نے ادب کے ساتھ اپنا رشتہ پختہ قائم کر لیا۔ مرزاحامد بیگ نے اپنے افسانوں میں مغلیہ عہد کو سمونے اور معاشرے میں موجود عام آدمی کے مسائل کو اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مرزاصاحب کے افسانوں کی بڑی خُوبی علامت نگاری ہے۔ اُنہوں نے لفظوں میں نئی جان ڈالنے کی کوشش کی اور اُنہیں نئے ڈھنگ سے برتا۔ اُن کے افسانوں کا اُسلوب تھوڑا تہہ دار اور پیچیدہ ضرور ہے لیکن اِس میں ندرت اور تنوع کے ساتھ نوکلاسیکی اور جدیدیت کا رجحان بھی ملتا ہے۔ وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ اُنہوں نے معاشرے کی دُکھتی ہورگ پر ہاتھ رکھا اور معاشرے میں ہونے والے ظلم و ستم اور ناانصافیوں پر کھل کر اظہار خیال کیا۔ مرزاحامد بیگ عہد حاضر کے ایک عظیم افسانہ نگار ہیں۔

مرزاحامد بیگ کے افسانوں کی تفصیل:

گمشدہ کلمات "افسانے"

اِس کتاب میں مرزاحامد بیگ کے 16 اُردو افسانے شامل ہیں۔ مرزاصاحب نے اِس کتاب کو داراشکوہ کے نام کیا ہے۔ اِس کے علاوہ اِس کتاب میں مظفر علی سید، سجاد باقر رضوی اور مہدی جعفر کے تجزیے بھی شامل ہیں۔ اِس کتاب کو دوست پبلی کیشنز نے 2002ء میں اسلام آباد سے شائع کیا۔

تار پر چلنے والی:

یہ کتاب 1 ناولٹ اور 11 افسانوں پر مشتمل ہے۔ اِس کتاب کا اِنتساب محمد خالد کے نام ہے۔ اِس کی پہلی اشاعت 1984ء کو پولیمر پبلی کیشنز لاہور سے جبکہ اشاعت دوم 2005ء میں دوست پبلی کیشنز نے اسلام آباد سے کی۔

قصہ کہانی "پنجابی افسانے"

اِس کتاب میں پنجابی زبان میں کل تیرا افسانے شامل ہیں۔ یہ کتاب 1984ء میں پنجابی ادبی بورڈ لاہور سے شائع ہوئی۔

گناہ کی مزدوری "افسانے"

اِس کتاب میں سولہ افسانے ہیں۔ اور اِس کتاب کا اِنتساب شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی اور وارث علوی کے نام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 1991ء میں ابلاغ پبلی کیشنز نے شائع کی جبکہ دوسرا ایڈیشن دوست پبلی کیشنز اسلام آباد سے 2015ء میں شائع ہوا۔

حمیدہ کی کہانی "کہانی"

یہ ناخواندہ افراد جو بالغان ہیں اُن کے لیے لکھی گئی ہے۔ اِس کہانی کو یونیسکو، اقوام متحدہ، امریکہ نے 27 زبانوں میں ترجمہ کروا کر شائع کرایا ہے۔

لاکر میں بند آوازیں "ہندی افسانے"

یہ کتاب ہندی افسانوں پر مشتمل ہے۔ اور اِس میں 23 افسانے شامل ہیں۔ اِس کتاب کو 2001ء میں پبلیشرز اینڈ ایڈورٹائزر نئی دہلی سے شائع کیا گیا ہے۔

جانکی بائی کی عرضی "افسانے"

اِس کتاب میں مختلف موضوعات پر لکھے دس افسانے شامل ہیں۔ اِس کا اِنتساب بلراج منیرا کے نام ہے۔ اِس کتاب کو دوست پبلی کیشنز اسلام آباد نے 2011ء میں شائع کیا۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

1: حامد بیگ، ڈاکٹر، "مرزا، گزر گئی گزران"، کراچی: مطبوعہ دُنیازاد، 2002ء ص 189

2:ایضاً۔ ص194

3:ایضاً۔ ص196

4:ایضاً۔ ص201

5:ایضاً۔ ص207

6:ایضاً۔ ص207

7:حامد بیگ، مرزا، "انار کلی"، "ناول" دوست پبلی کیشنز، 2017۔ ص86

8:زینت عباس، ناول، "انار کلی" کا تنقیدی جائزہ، لاہور: مقالہ برائے ایم۔اے اُردو، پنجاب یونیورسٹی۔ ص 141 / 142

9:ایضاً۔ ص142

10: آمنہ، "انار کلی، ایک رُکا ہوا فیصلہ"، دانش ڈاٹ کام 27 جنوری 2018ء

11: حامد بیگ، مرزا، "تار پر چلنے والی"، لاہور: پولیمر پبلی کیشنز چوک اُردو بازار، 1983ء ص102

12: حامد بیگ، مرزا، "گناہ کی مزدوری"، راولپنڈی: ایس۔ٹی پرنٹرز گوالمنڈی، 1991ء۔ ص12

13: راغب شکیب، "اِرتکاز"، کراچی: جلد نمبر 2 شمارہ نمبر، مارٹن کوارٹرز، جہانگیر روڈ 2 اکتوبر 1995ء، ص26

14: ایضاً۔ ص23

15: حامد بیگ، مرزا، "جانکی بائی کی عرضی"، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2011ء۔ ص8

Books:

- Baig, Hamid, Dr. *Mirza, Guzar Gayi Guzran*. Karachi: Dunyazad Publications, 2002
- Baig, Mirza Hamid. *Anarkali: A Novel*. Dost Publications, 2017
- Abbas, Zeenat. *A Critical Analysis of the Novel "Anarkali"*. Master's thesis, Punjab University, Lahore
- Amna. *"Anarkali: A Frozen Decision."* Danish.com, 27 Jan. 2018
- Baig, Mirza Hamid. *Taar Par Chalne Wali*. Lahore: Polymer Publications, Urdu Bazaar, 1983
- Shaqib, Raghib. *"Irtikaz." Karachi*, vol. 2, issue no. Martin Quarters, Jahangir Road, 2 Oct. 1995
- Baig, Mirza Hamid. *Janki Bai Ki Arzi*. Islamabad: Dost Publications, 2011
- زوہیب اصغر, وسیم ارشد, and شہرام ارشد. **"خالد فتح محمد کے افسانوں کا مجموعی جائزہ."** *Jahan-e-Tahqeeq*, vol. 7, no. 2, 2024, pp. 69-77. https://jahan-e-tahqeeq.com/index.php/jahan-e-tahqeeq/article/view/1359.
- سعدیہ ثناء اللہ, and وسیم ارشد. **"رابعہ الربآّ کے افسانوں کا جائزہ."** *Harf-o-Sukhan*, vol. 8, no. 2, 2024, pp. 119-128. https://harf-o-sukhan.com/index.php/Harf-o-sukhan/article/view/1314.
- ڈاکٹر منزہ منور, وسیم ارشد, and محمد اکرام الحق. **" اکیسویں صدی کے اُردو افسانوں میں سماجی شعور."** *Jahan-e-Tahqeeq*, vol. 7, no. 2, 2024, pp. 78-85. https://jahan-e-tahqeeq.com/index.php/jahan-e-tahqeeq/article/view/1360.
- اسلم حمید, وسیم ارشد, and شہرام ارشد. **"اردو نثری نظم کی روایت… تجزیاتی مطالعہ."** *Harf-o-Sukhan*, vol. 8, no. 1, 2024, pp. 282-289. https://harf-o-sukhan.com/index.php/Harf-o-sukhan/article/view/1155.